جدید اُردو تنقید کا ایک معتبر حوالہ: تبسم کاشمیری

ڈاکٹر محمد امجد عابد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
ڈاکٹر قربان علی
لیکچرر، گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائز، لاہور
ڈاکٹر عبدالرحیم
لیکچرر، گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائز، لاہور

Abstract:
Dr. Tabassum Kashmiri earned fame in different capacities of Urdu literature. He contributed in Urdu literature multidimensionally with considerable multi aspects of the views and features. He highlighted issues of modern world attitudes of violation of traditionalism as social dilemma. He strongly supported the views that present criticism is unable to reflect, deliver and pointout the right direction. Author of the article is of the opinion that Tabassum Kashmiri is well aware of the art produced and contributed by the authors of present era. Author of the article is of the opinion that Tabassum Kashmiri not only well aware but also associated with the conclusion and functions of the present criticism.

Keywords: Research, Criticism, Modernism, Style, Manto, Contemporary Consciousness

کلیدی الفاظ: تحقیق، تنقید، جدیدیت، اسلوب، منٹو، عصری آگہی

تبسم کاشمیری (پ۔ ۱۹۴۰ء) نے مختلف حیثیتوں سے اردو ادب میں شہرت حاصل کی۔ وہ بہ یک وقت ایک محقق، نقاد، تاریخ دان اور شاعر ہیں۔ انہوں نے ادب کی مختلف جہتوں پر کام کیا ہے اور فکر انگیز مضامین کے ذریعے بہت سے ایسے گوشوں کو نمایاں کیا ہے جو اس سے پہلے پردے میں تھے۔ تبسم کاشمیری کی شاعرانہ حیثیت الگ سے ان کے تخلیقی طرزِ احساس کا پتہ دیتی ہے لیکن انہوں نے تحقیق اور تنقید کے میدان میں بھی تخلیقی ہنر آزما کر ان کے بارے میں مروّجہ تصورات کو بدل دیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے ادبی تاریخ قلم بند کرتے ہوئے بھی تخلیقی اور تنقیدی پیرائے کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اس سلسلے میں اپنے نقطہ نظر کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "ادبی مورخ کا کام صرف واقعات اور حقائق تک محدود نہیں ہے۔ وہ واقعات اور حقائق سے بڑھ کر ایک اور اہم فریضہ انجام دیتا ہے۔ واقعات و حقائق اور تاریخ کے مطالعہ سے وہ ادبی تاریخ کے کسی دور، رجحان، نظریے یا کسی شخصیت کے بارے میں ایک وژن (vision) مہیا کرتا ہے۔ ادب کی تاریخ کو جو قوت ادبی تاریخ بناتی ہے وہ ادبی مورخ کا وژن ہے۔ تاریخ کے خاموش، گمنام اور تاریک گوشوں کو اس کی ذہنی بصیرت روشن کر دیتی ہے۔ بکھرے ہوئے مواد اور غیر مرتّب تصورات کو ایک مربوط معنی دے کر وہ کسی عہد کو با معنی بنا دیتا ہے۔ وہ چیزیں جو پہلے محسوس نہ ہوتی تھیں، اب ہمیں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ادبی مورخ کے

مشاہدے کے ذریعے ہم سیاسی تاریخ کی دھڑکنیں سننے لگتے ہیں اور تاریخ کا منظر نامہ متحرک ہو کر سامنے سے گزرنے لگتا ہے اور بالآخر ہم اس عہد کی عصری حساسیت کا مشاہدہ کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ادبی مورخ کے ہمہ گیر علم ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ فلسفہ، نفسیات، سیاست، تہذیب اور ثقافت میں غواصی کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ادبی مورخ ہمیں کسی عہد کے وژن سے آشنا کرے۔"(۱)

اس قدرے طویل اقتباس کی روشنی میں جہاں تبسم کاشمیری کے ادبی تاریخ کے تصور کی نشاندہی ہوتی ہے وہاں اس بات کا علم بھی ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ادبی تاریخ لکھتے ہوئے مختلف سماجی علوم کے مطالعے اور تحقیق و تخلیق و تنقید کی کس قدر ضرورت درکار ہے۔ یوں تاریخ نویسی ایک معروضی عمل ہوتے ہوئے بھی محض معروضی عمل بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ اس سے بڑھ کر تنقیدی اور تخلیقی پیرایہ اختیار کر کے وہ ایک غیر معروضی عمل بن جاتی ہے۔ تبسم کاشمیری نے ہمارے بعض اہم تحقیق نگاروں کے اس نقطہ نظر سے بھی اختلاف کیا ہے کہ تحقیق اور تنقید دو الگ الگ ڈسپلن ہیں اور ان دونوں میں کسی نوع کا ربط یا معنویت نہیں ہے۔ نیز یہ کہ نقاد اور محقق دو مختلف راستوں پر چلنے والے ہوتے ہیں۔ نقاد تحقیق کے نتائج کے بغیر بہت سی صورتوں میں اپنا کام انجام نہیں دے سکتا لیکن محقق تنقید کے نتائج سے بے نیاز ہوتا ہے۔ ظن، قیاس، تعبیر، تاویل اور ذوق یہ سارے اجزا تنقید کے لیے اہم حیثیت رکھتے ہیں جبکہ تحقیق میں یہ اظہار احتمال کے سوا اور کسی کام نہیں آسکتے۔

تبسم کاشمیری کے خیال میں تحقیق و تنقید دو جداگانہ شعبے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ وہ تحقیق کے لیے تنقید کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس خیال کو رد کرتے ہیں کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

”ہمارے ہاں تحقیق و تنقید کو بالکل مختلف اور متضاد خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور اکثر کوشش یہ کی جاتی ہے کہ ادھر کی ہوا ادھر نہ جائے اور یہ دونوں خانے اپنی اپنی انفرادی حیثیت میں الگ الگ رہ کر کام کریں۔۔۔۔ دراصل تحقیق اور تنقید کو جبری طور پر تقسیم کیا گیا ہے اور اس میں بڑی خرابی تحقیق کا غلط مفہوم ہے۔ ہمارے ادب میں تحقیق کو نہایت محدود معنی میں مقید کر دیا گیا ہے۔ اس کا دائرہ کار بے حد سکڑ گیا ہے اور یوں تحقیق ایک چھوٹے دائرے میں حرکت کرتی نظر آتی ہے۔۔۔۔ میرے خیال میں تحقیق اور تنقید کو دو بالکل مختلف میدان سمجھنے کا سلسلہ بند کر دینا بہتر ہے۔“(۲)

تحقیق حقائق کی شکل میں خام مال فراہم کرتی ہے اور پھر ان حقائق کا تنقیدی تجزیہ کر کے کوئی با معنی اور بصیرت افروز تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے تحقیق اور تنقید لازم و ملزوم ٹھہرتی ہیں مگر کچھ محقق حضرات نے تنقید کو یکسر تحقیق سے خارج کر دیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ تحقیق میں اگر تنقید کا عمل شروع ہوا تو تحقیق ختم ہو جائے گی۔ مگر بقول تبسم کاشمیری:

”اس نقطہ نظر نے تحقیق و تنقید میں گہری خلیج حائل کر دی۔۔۔۔ تحقیق سے تنقید کے اخراج کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو تحقیق اور وژن پیدا نہ ہو سکا اور ہماری تحقیق یک جہتی ہو کر رہ گئی۔“(۳)

تبسم کاشمیری اس نقطہ نظر کے حامی ہیں کہ جدید علوم اپنے اپنے دائرہ کار اور حدود میں کام کرنے اور اپنی اپنی منفرد حیثیت رکھنے کے باوجود ان دائرہ ہائے کار اور حدود کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں۔ یہ بین الشعبہ جاتی علوم کا زمانہ ہے۔ اب علوم کا آپس میں گہرا علمی اشتراک پایا جاتا ہے۔ ایک علم کا شعبہ دوسرے شعبہ علم کے اشتراک سے نئی نئی علمی جہات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"فلسفہ، نفسیات، دیومالا، سیاست، تہذیب اور ثقافت میں غواصی کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ادبی مؤرخ ہمیں کسی عہد کے وژن سے آشنا کر دے۔"(۴)

تبسم کاشمیری نے اردو ادب کی تاریخ میں اپنے اسی تصور کے مطابق تنقیدی اسلوب اختیار کیا ہے۔ وہ تاریخی حقائق بیان کرتے ہوئے تنقید و تجزیہ بھی کرتے جاتے ہیں جس سے اس عہد کی صورتحال واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے اور ادبی روایت کا تعین بھی ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"ہم یہاں اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ میر و سودا تک اردو شاعری نے جو مسافت طے کی تھی، اس میں ایک شعری روایت کی تشکیل کا سامان تو فراہم کر دیا گیا تھا مگر انسان، حیات اور کائنات کے بارے میں اس شاعری کا تصور محض سطحی تھا۔ یہ شاعری زندگی کی بصیرت پیدا نہ کر سکتی تھی اور نہ ہی اس نے انسان جیسی گہری اور پُر معنی چیز کے خانوں میں جھانک کے ہی دیکھا تھا۔ یہ شاعری اپنے عہد کے پیچ در پیچ مسائل کے اندر بھی نہ اتر سکی تھی۔ اس لیے یہ شاعری اپنے عہد کی سطحی تصویر کی سطحی زندگی بنانے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔"(۵)

تبسم کاشمیری نے اردو ادب کے حوالے سے جتنی کتابیں بھی لکھی ہیں ان میں خالص تنقیدی کتب سے الگ تحقیقی کتابوں پر بھی تنقید کی چھاپ بہت گہری ہے۔ ان کی تنقیدی کتب میں "اقبال نئی قومی ثقافت"(۱۹۷۷ء)، "شعریات اقبال۔ نئے شعری تجزیے"(۱۹۷۷ء)، "فسانہ آزاد۔ ایک تنقیدی مطالعہ"(۱۹۷۸ء)، گلزار نسیم۔ تنقیدی مطالعہ" (۱۹۷۸ء)، "نظم آزاد۔ مقدمہ و تنقید"(۱۹۷۸ء)، "نئے شعری تجزیے"(۱۹۷۸ء)، "اقبال، تصور، قومیت اور پاکستان"(۱۹۷۷ء) شامل ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے متعدد تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کی تنقید کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ دیگر ناقدین کے طرزِ فکر اور انداز تنقید سے ہٹ کر نئی بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کے دائرہ تنقید میں جو ادبی شخصیات اور ان کی تخلیقات شامل ہیں، ان میں اقبال، سرشار، ن۔ م راشد، میراجی، مصحفی، مجید امجد، حسرت، آزاد، منٹو وغیرہ شامل ہیں۔ منٹو کی کہانی "موذیل" پر ان کا تنقیدی مضمون ان کی گہری بصیرت اور سماجی شعور کا آئینہ دار ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے خاص طور پر موذیل کے کردار کا جو تجزیہ کیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"موذیل کے کردار کی کئی جہتیں ہیں۔۔۔ اس مختصر سے مقالے میں میں نے موذیل کی سائیکی کو تلاش کرنے کی ایک کوشش کی ہے۔۔۔ کیا جنسی عمل اس کی منہیات کی فہرست میں تھا؟ اگر ایسا تھا تو اس کا سبب کیا تھا؟ ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں مظہریاتی تنقید کا راستہ اختیار کر کے کہانی کے متن میں زیرِ سطحی معنوں کا سفر کرنا ہو گا۔"(۶)

"موذیل" کے کردار کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ منٹو "موذیل" کی شکل میں ایک سوال چھوڑ گیا ہے کہ کیا بڑا انسان صرف نیک لوگوں میں چھپا ہوتا ہے یا بڑا انسان موذیل جیسی لامذہب، مذہب سے بیزار اور آزاد خیال عورت کے اندر بھی ہو سکتا ہے۔ بقول تبسم کاشمیری:

"اس نے صدیوں سے ان تصورات کو رد کیا کہ بدلوگ بد ہی ہوتے ہیں۔ منٹو کی اخلاقی تھیوری یہ کہتی تھی کہ نیکی، اخلاقیات اور برائی بڑے لوگوں ہی کی میراث نہیں ہے۔ یہ سماج کے پست ترین طبقات میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مگر منٹو سے پہلے سماج کے کرداروں کو اس نظر سے دیکھنے کی کوئی روایت نہ تھی اور نہ ہی اسے ممکن سمجھا جاتا تھا۔ انسان اور انسانیت کے تصورات پر اشرافیہ کا قبضہ تھا۔ منٹو نے ان تصورات کو اشرافیہ سے آزاد کروایا اور عام انسانوں میں تلاش کر کے اردو دنیا کے نئے انسانوں کے استعارے عطا کیے۔ یہ منٹو کی بہت بڑی کنٹری بیوشن تھی۔"(۷)

تبسم کاشمیری کی تنقید میں کسی فن پارے کے خالق اور اس عہد، جس میں وہ تخلیق ہوا، کے تہذیبی، سیاسی، اور معاشرتی مسائل کو بڑی عمیق نظری سے دیکھا گیا ہے۔ موذیل ہی کے ضمن میں ہی ان کا تنقیدی انداز دیکھیے:

"نیکیوں کو سب گلے لگا لیتے ہیں۔ متقی اور پرہیز گاروں کو آگے بڑھ کر ملتے ہیں سر جھکا کر ان کے ہاتھ چومتے پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور اس عمل سے سرشار ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر بدوں کو گلے کون لگائے گا، ان سے محبت کون کرے گا۔ منہ سے شراب کی بو سونگھ کر کون آگے بڑھے گا؟ ہاں یہ ممکن ہے مگر یہ تو کوئی صوفی ہو سکتا ہے جو اپنے دل دریا میں ان کو جگہ دے۔ اردو فکشن میں ہمارے پاس ایک صوفی منش موجود ہے اور منٹو اردو فکشن کا صوفی منش ہی تو تھا جس کے چاہنے والوں میں کیسے کیسے بدنام کردار تھے۔ قحبہ کانوں کی عورتیں دلال وغیرہ۔ وہ لوگ جن کو دیکھ کر روایتی نیکی دوڑ لگا جاتی ہے۔ یاد کیجیے موذیل، بابو گوپی ناتھ کو، اشیر سنگھ کو، ممی کو اور دیگر کرداروں کو جو نیکی کی دولت سے محروم نہ ہوئے جن کے اندر کا انسان جاگ کر اپنی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔"(۸)

منٹو کے "موذیل" کے ان کرداروں کے معاشرتی رویوں کو دیکھا جائے تو ہمیں ایک پوری تہذیبی وفکری روایت نظر آتی ہے۔ موذیل کے یہ کردار ہمارے موجودہ عہد کے کردار نظر آتے ہیں۔ تبسم کاشمیری ان کرداروں کے ذریعے اس دور کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

گزشتہ چند دہائیوں کے دوران میں نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ عالمی سطح پر بھی جو تغیرات رونما ہوئے ہیں ان کے نتیجے میں ہم ایک انتشار زدہ صورتحال سے دوچار ہو گئے ہیں۔ عام فرد کی طرح ہمارا تخلیق کار بھی شدید ذہنی دباؤ اور انتشار کا شکار ہے۔ مثبت معاشی قدریں اور اخلاقی رویے درہم برہم ہو گئے ہیں۔ ایسے میں جو تخلیقات وجود میں آئی ہیں اور ان کے حوالے سے جو تنقید لکھی جا رہی ہے وہ کسی طرح بھی ایک صحت مند معاشرے کو نمایاں نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے نتیجے میں مثبت اخلاق قدروں کی عکس نمائی ہوتی ہے۔ ایسی ہی تصویر کشی منٹو نے اپنے افسانوں کے ضمن میں کی ہے۔ تبسم کاشمیری نے منٹو اور اس کی وجودی اخلاقیات کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ وہ اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

"اگر آج منٹو زندہ ہوتا تو اس عہد کے خوف ناک حد تک بدلے ہوئے رویوں کو دیکھ کر اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس عہد کے سماج میں شاید وہ بابو گوپی ناتھ، ممی یا موذیل جیسے کسی کردار کو ہرگز تلاش نہ کر سکتا۔ آج کے انسان کے مقابلے میں منٹو کے بابو گوپی ناتھ اور ممی یا موذیل بہت ارفع کردار تھے۔ وہ اپنی انسانی کمزوریوں کے باوجود اپنے خصائص کے لحاظ سے بہت بلند لوگ تھے۔ اس سماج میں ممیاں بہت ہیں۔ بے شمار بابو گوپی ناتھ ہیں اور لاتعداد موذیلیں ہیں مگر ان کے پاس منٹو کے کرداروں کا دل نہیں۔ ان کے اندر وہ انسان نہیں جسے منٹو دریافت کر لیا کرتا ہے۔"(۹)

اس اقتباس کی روشنی میں تبسم کاشمیری یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ "انساں کی خبر لو کہ وہ دم توڑ رہا ہے"۔ آج کے انسان کی ذہنی وفکری ساخت میں بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُن حالات کا گہرائی اور گیرائی سے جائزہ لیا جائے اور اس بنیادی احساس کو دریافت کیا جائے جو کہیں کھو گیا ہے۔

تبسم کاشمیری نے میراجی کی شخصیت کے گرد موجود پر اسرار ہالے سے یکسر ہٹ کر ان کی شعری کائنات میں غواصی کر کے اُن کے تخلیقی عمل کی باز آفرینی کی ہے اور میراجی کی تفہیم کے کئی در وا کیے ہیں۔ اُنھیں میراجی کی شاعری میں ذات، کائنات اور انسان کی بے کرانیوں میں انسان کے تہذیبی، ثقافتی اور عمرانی رویے پوری طرح شریک ملتے ہیں۔ میراجی کی شاعری میں ان کے عہد اور اُس عہد کے انسان کے داخلی اور خارجی احساسات کی بازگشت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے میراجی کے فن کے مرکزی نقاط کی تلاش کرتے ہوئے اسے عصر حاضر کی شعری دنیا کا جگمگاتا ستارا کہا ہے۔ جس سے آج بھی نئی نظم روشنی حاصل کر رہی ہے۔ ان کے مطابق:

"جدید اُردو نظم کے فریم ورک میں میر اجی نظم کے حقیقی وجود کی تلاش میں سر گرداں ملتا ہے۔ وہ نظم کے وجود میں فلسفہ، فکر، تفکر اور سوچ وفکر کے موضوعات کی تلاش میں نہیں نکلتا ہے۔ اسے تلاش ہوتی ہے خیال کی، جذبے کی احساس کی اور جمالیاتی رویوں کی۔ اس کی نگاہ نظم کے وجود کے مرکز کی متلاشی ہوتی ہے۔ ادھر اُدھر دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہ مرکز تک جا پہنچتی ہے۔ اس جگہ سے نظم کا وجود اس کے سامنے اپنی شکل بنانے لگتا ہے اور ہوتے ہوتے وجود کے سارے رموز، سارے نقاط اور سارے زاویے مکمل ہو جاتے ہیں۔ میر اجی کے تنقیدی کرافٹ میں یہ عمل بے حد متاثر کرنے والا ہے۔ میر اجی سے پیشتر کسی اُردو نقاد نے نظم کو اس طرح سے اپنے حصار میں لینے کے لیے سوچا تک نہ تھا۔"(۱۰)

اس طرح شعری پس منظر سے تلاش کے راستے پر نکلے قاری کو میر اجی کی نظم موضوعی فہم عطا کرتی ہے اور نظم کے وجود کے سبھی داخلی اور خارجی مظاہر، میر اجی کی موضوعیت کی تخلیق کے سبھی مظاہر پرت در پرت قاری پر کھلتے چلے جاتے ہیں اور قاری ممکن حد تک میر اجی کی نظم کی معنویت کے قریب پہنچ جاتا ہے جس سے ہمیں میر اجی کی نظم کے شعور اور میر اجی کے اپنے فکری و عصری شعور سے آشنائی ملتی ہے۔

ن۔م راشد، تبسم کاشمیری کا مرغوب ترین تنقیدی موضوع ہے۔ جسے انہوں نے ہر زاویے سے دریافت کیا اور اس کی سطحوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی تصنیف "لا=راشد"، ن۔م راشد کی جہتوں کی عُقدہ کشائی کرتی ہے۔ اس تصنیف میں انہوں نے جہاں راشد کے تہذیبی لاشعور کو دریافت کیا ہے اور اس کے یہاں مایوسی اور رجائیت کی کش مکش اور خوابوں کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی ہے وہاں اس کی شعری علامتوں، شہر کی تمثالوں اورآگ کی تہذیبی علامت کی ماہیت جاننے کی بھی سعی کی ہے۔ ان کے مطابق:

"راشد کو دیکھئے تو اس کی شاعری کے منظر نامہ پر انسانی آشوب، انحطاط، سماجی جبر اور تشدد، غلامی، استحصال اور سماجی تبدیلیوں کا عمل بہت تیزی سے ابھرتا ہے۔ اس کا لب و لہجہ کہیں کہیں بلند بھی ہو جاتا ہے یوں راشد کا شعری افق سماجی اور تہذیبی واردات کو پیش کرتا ہے۔"(۱۱)

تبسم کاشمیری کے خیال میں راشد کی نظم اپنی فنی پختگی کے ساتھ ساتھ گردوپیش کی علامات اور ان کے نہایت بلیغ معانی کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔ آلام و آسیب کے خونی ہاتھوں میں جکڑی انسانیت میں زندگی کی رمق اور حرارت کا ذکر کرتے ہوئے اسے جھکتے اور مٹتے ہی چلے جانے کی بجائے راشد سر اٹھا کر چلنے کا درس دیتے ہیں۔

تبسم کاشمیری نے راشد کے بعد سب سے زیادہ اقبال پر لکھا۔ اقبال پر ان کی تین باقاعدہ تنقیدی تصانیف موجود ہیں جن میں ان کے یہاں نئی قومی ثقافت اور ان کے تصور قومیت اور پاکستان کو موضوع بنایا گیا ہے۔

جدیدیت کے تناظر میں تبسم کاشمیری کا نقطہ نظر نہایت واضح ہے۔ وہ نظم میں جدید شعرا کے فنی اور فکری تجزیوں کے ذریعے اپنے کئی مضامین میں جدیدیت کے خدوخال واضح کرتے ہیں۔ ان کے مطابق جدیدیت کا مقصد حقیقت کی از سر نو تلاش ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہر دور اپنے لیے ایک زندہ حقیقت تلاش کرتا ہے اور اس حقیقت کے سہارے اس کا تخلیقی عمل جاری رہتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت زندہ تجربات کو ظاہر کرتی ہے اور ان تجربات میں معاشرتی اشکال کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ان معاشرتی اشکال میں اس عہد کا دریافت کردہ شعور نمایاں ہوتا ہے جسے اس عہد کا شعور کہہ سکتے ہیں۔ یہ جدید شعور اس عہد کے معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی ادراک سے حاصل ہوتا ہے اس شعور سے ہم معاشرتی ڈھانچہ کے شعور کو جان سکتے ہیں"(۱۲)

مزید لکھتے ہیں:

”ہر عہد کی جدیدیت اگلے عہد میں کلاسیک بن جاتی ہے ، اس کلاسیک کے خلاف ایک نئی جدیدیت کا ظہور ہوتا ہے۔ جدیدیت اپنے عہد کے معروضی تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے جب تک اس میں تخلیقی توانائی کا جوہر برقرار رہے یہ زندہ رہتی ہے۔ تخلیقی توانائی کا جوہر معروضی صورت حال کے بدلنے سے بدلنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگتا ہے۔ جدیدیت پیدا ہوتی ہے، معروضی صورتِ حال بدلنے سے خود کو مارتی ہے اور ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔“ (۱۳)

مجموعی حوالے سے دیکھا جائے تو تبسم کاشمیری ایک اہم نقاد ہیں جنہوں نے اپنی تنقید میں جس ادبی شخصیت یا ادب پارے کا مطالعہ کیا اسے خاص طور پر عصری آئینے میں رکھ پر اپنے عہد کے طرزِ احساس کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تنقید اپنے عہد کی عصری آگہی اور شعور سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ وہ بنیادی طور پر ارضیت کے قائل ہیں۔ مافوق الفطرت صورتحال سے گریز کی راہ اختیار کر کے اپنے عہد اور زمانے کی سانسوں سے سانسیں ملا کر چلنے کے قائل ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،اُردو ادب کی تاریخ،ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک،لاہور،سنگ میل پبلیکیشنز،۲۰۰۹ء،ص۱۴

۲۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،ادبی تحقیق کے اصول،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۲ء،ص۱۳۔۱۴،۱۶

۳۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، عملی تحقیق،مرتبہ:ڈاکٹر تبسم کاشمیری، محمد ذیشان وکیل،پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی،لاہور،۲۰۱۸ء،ص۵

۴۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،اردو ادب کی تاریخ:ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک،ص۱۴

۵۔ ایضاً،ص۲۸۹

۶۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،موذیل، مضمون مشمولہ:تناظر،گجرات،سوشیو لٹریری فورم،۲۰۱۳ء،ص۳۰۳۔۳۰۴

۷۔ ایضاً،ص۳۰۷

۸۔ تبسم کاشمیری، منٹو کی وجودی اخلاقیات، مضمون مشمولہ: تحقیقی زاویے،الخیر یونیورسٹی بھمبر،شمارہ:۱،جنوری۔جون،۲۰۱۳ء،ص۱۱۱

۹۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،منٹو اور موجودہ انسانی رویے،معیار،جلد:۹،جنوری تا جون،۲۰۱۳ء،ص۳۳۰

۱۰۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،میرا جی اور جدید نظم کی تفہیم کا فریم ورک، مضمون مشمولہ:بنیاد، جلد چہارم،لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز،۲۰۱۳ء،

ص۱۸۹

۱۱۔ تبسم کاشمیری،لا=راشد، نگارشات،لاہور،۱۹۹۴ء،ص۶۰

۱۲۔ تبسم کاشمیری،جدیدیت کیا ہے، مضمون مشمولہ:نئے شعری تجزیے،سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۷۸ء،ص۱۵۵

۱۳۔ ایضاً،ص۱۵۴